Lesson 1: Hijr (Ayaat 1- 50): Day 4

سُوْرَۃُ الْحِجر کی تفسیر

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں اور ہم ان کو بمقدار مناسب اُتارتے رہتے ہیں.

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ خزائن خزانہ سے ہے اور خزانہ کہتے ہیں کسی چیز کو جمع کرنا اور پھر اس کی حفاظت کرنا۔ یہ اردو زبان کا لفظ ہے اور بظاہر عربی زبان میں لگتا ہے۔ خزانہ کو سٹور تیج سمجھیے جیسے دنیا میں دو طرح کی دُکانیں ہوتی ہیں ایک ہوتی ہیں جہاں ہم جا کے خریداری کرتے ہیں۔ تھوڑا تھوڑا سامان ہر جگہ رکھا ہوتا ہے اور ہم اسے خرید لیتے ہیں۔ کچھ دوسری جگہیں ہوتی ہیں جن کو سٹور تیج کہتے ہیں اور یہ بڑے بڑے سٹور تیج ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے شیلرز بنے ہوتے ہیں جن کو ویئر ہاؤس بھی کہتے ہیں تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ اصل خزانے ہم نے رکھے ہوئے ہیں اور پھر فرماتے ہیں وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ہم نہیں نازل کرتے اس میں سے مگر ایک طے شدہ اندازے کے مطابق۔ لفظ خزانہ کو گودام لکھ لیجئے۔

اللہ تعالی نے جتنا مجھے رزق دینا تھا وہ سارا لکھ دیا ہوا ہے۔ اب میرے پاس صرف اتنا ہی ہے جو مجھے پتہ ہے کہ میں نے دو چار دن میں کھالینا ہے اور باقی، عِنْدَنَا، ہر ایک کے رزق کا اصل سٹور تیج اللہ کے پاس رکھا ہوا ہے۔ ڈیلی بیس پہ جو ہم شاپنگ کر کے چیزیں خرید کر لاتے ہیں، جو ہمارے فریج میں آ رہی ہیں، زیادہ اس لیے نہیں لاسکتے کہ ہم رکھ نہیں سکتے۔مثال کے طور پر اگر کوئی بچہ پیدا ہو اور ساتھ ہی ایک اناج کی لائن لگ جائے، ڈھیر لگ جائے، تو آپ کہاں رکھیں گے۔ ذرا فالتو چیز گھر میں آجائے تو

فکر لگ جاتی ہے کہ اب اسے کہاں رکھیں۔ تو اس لئے اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ لا محدود خزانے میرے ہیں اور تمھیں تو صرف ضرورت کی چیزیں دیتے ہیں۔ اگر سب تمھیں سنبھالنا پڑتا تو پھر تو تم نمازیں بھی نہ پڑھتے۔ بعض دفعہ تو ہم اپنے گھروں کو بھی گودام بنا لیتے ہیں۔ چیز ہے لیکن ملتی نہیں۔ وہ اللہ تعالی، کیا وہ ہمیں بھوکا سلائے گا۔ پہلے زمینوں کی، اور آسمان کی، پھر رزق کی بات ہوئی اور اب بات ہو رہی ہے ہواؤں کی۔ یہ پیغامبر ہیں۔ ایک پیغامبر وہ ہوتا ہے جو نبی اور رسول کی شکل میں آتا ہے۔ جو زبانِ حال سے بولتا ہے، لیکن یہ وہ پیغامبر ہیں وہ مسینجر ہیں جو اللہ کے وجود کا پتہ دیتے ہیں۔ چلتی ہوئی ہواؤں سے پوچھو اللہ کون ہے؛

وَاَرۡسَلۡنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَيۡنٰكُمُوۡهُ‌ۚ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ لَهٗ بِخٰزِنِيۡنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں (جو بادلوں کے پانی سے) بھری ہوئی ہوتی ہیں اور ہم ہی آسمان سے مینہ برساتے ہیں اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے

لفظ لَوَاقِحَ ہے لاقح سے ہے ل، ق، ح اس کا روٹ ہے۔ اور لاقح، کہتے ہیں بارآور، بوجھ اٹھائے ہوئے، کوئی چیز جو کسی کو ذرخیر بنانے کا ذریعہ بنے۔ جیسے ایک عورت پریگنڈ نینٹ ہے جو بچے کو اٹھائے ہوئے ہے لیکن ایک وہ چیز جو عورت کو پریگنڈ نینٹ کرتی ہے-اس سے مراد یہ ہے۔ یعنی ہوائیں بادلوں کو اٹھاتی ہیں، بارش لاتی ہیں، سائنس میں اس کو پولن گرین کہتے ہیں-یہ کیسے ہواؤں کے ذریعے چھوٹے چھوٹے پولنز جو اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ہوتے ہیں۔ پودوں میں بھی میل اور فیمیل ہوتے ہیں۔ فیمیلز پولن میل پر جاتے ہیں۔ اس طرح کی تبدیلیاں ہوتی ہیں یعنی میل، فیمیل مل جاتے ہیں اور ہوائیں اٹھا اٹھا کے اور مچھلیاں اور اسی طرح تتلیاں، اور شہد کی مکھیاں بھی سارا دن یہی کام کر رہی

ہیں۔ جو اسے اِدھر سے اُدھر لاتی ہیں۔ ہم نے کبھی سوچا کہ یہ کیسے ہو رہا ہے۔ یہ وہی ذات ہے جو ہم قرآن میں پڑھ رہے ہیں؟ فَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسۡقَيۡنٰكُمُوۡهُ پھر ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور پھر تم لوگوں کو پلایا۔ پانی جو حیات کا ذریعہ ہے حیات کا وجود دینے والا ہے۔ پانی کہاں سے آتا ہے؟ اس کا ایک بہت خوبصورت نظام ہے۔

آج کے دور میں اس کو واٹر سائیکل کہتے ہیں۔ کس طرح سمندروں سے ہواؤں تک بخارات کے ذریعہ پہنچانا، پھر بارش سے برف باری، پھر گلیشیر سے بلند و بالا پہاڑ، اور پھر چشموں، ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعے پانی کو میدانی علاقوں میں لے جانا، پھر زیرِ زمین پانی کا عظیم الشان ذریعہ یہ سب کچھ کر کے اللہ تعالی کہتے ہیں وَمَاۤ اَنۡتُمۡ لَهٗ بِخٰزِنِيۡنَ تم اس کے جمع کرنے والے نہیں ہو۔ یہ تمہارے بس میں نہیں تھا کہ تم اس کو جمع کرتے۔ ہم خواتین کی اکثر عادت ہے ہم کہتی ہیں کہ مجھے تو 101 کام ہے، آپ تو بس آرام سے بیٹھے رہتے ہیں آپ کو تو بس ایک کمانے کا کام ہے۔ اگر یہ کام بھی ہم سب کو کرنے پڑتے۔ روز جا کے ہواؤں کا بٹن دبانا، بادلوں کا، زمین کا، سورج کا، چاند کا، پولنز گرین کا، تتلیوں کا، مچھلیوں کا تو ہمارے سر پہ ہر وقت سر درد کی وجہ سے پٹیاں بندھی ہوتیں۔ کتنے کام ہے جو ہمارا رب کر رہا ہے اور اگر اللہ یہ کام روک لے تو ہم کچھ بھی نہ کریں۔ اتنے کام کر کے بھی یہ لگ رہا ہے کہ یہ دنیا نہ ختم ہونے والی ہے لیکن ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی کسی کو جھنجوڑ کے کہہ رہا ہوں کہ ایسے ہی نہ رہنا یہ بھی ختم ہو جانا ہے۔

وَاِنَّا لَـنَحۡنُ نُحۡىٖ وَنُمِيۡتُ وَنَحۡنُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۲۳﴾

اور ہم ہی حیات بخشتے اور ہم ہی موت دیتے ہیں۔ اور ہم سب کے وارث (مالک) ہیں

یہاں پر معنی "زندہ کرتے" نہیں بلکہ "زندہ رکھتے" ہیں۔ اور ہم موت بھی وارد کرتے ہیں اور بالآخر الْوٰرِثُوْنَ ہم ہی وارث ہوں گے۔ تم اس دنیا کا غم کھاتے ہو بچوں کی فکر، ان کی وراثت کی فکر، ان کے مستقبل کی فکر اور اسی طرح بیٹیوں کے رشتوں کی فکر۔ تم سب کچھ کر لو لیکن اگر اللہ نہ چاہے تو خیر نہیں ملے گی۔ یہ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ میں اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ تم اپنے وارثوں کے لئے سب کچھ جمع کرتے ہوئے اپنی آخرت نہ ختم کر دینا۔ اکثر ماں باپ کی کوشش ہوتی ہے کہ بچوں کے لئے کچھ اور چھوڑ دیں کچھ اور چھوڑ دیں، کچھ اور محنت کر لیں چلو بعد میں ان کے کام آئے گا۔ ان کے لئے کچھ کرتے کرتے اپنی آخرت بھول جاتے ہیں۔ بچوں کی دنیا بناتے بناتے ان کی آخرت نہ بھول جاؤ۔ تم یہ سوچتی ہو کہ میں مر گئی تو میرے بچوں کا کیا ہو گا، بلکہ یہ سوچو کہ میرے بچے مر گئے تو ان کا کیا ہو گا؟ اور جو تم ان کے لئے چھوڑ رہے ہو لاکرز میں، بینکوں میں اور گھروں میں ان کے پاس کہاں رہنا ہے نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ وارث تو ہم ہیں۔ بالآخر سب کو جانا ہے۔ یہ بڑا اُداس کرنے والا جملہ ہے۔ اس میں صرف ہماری موت ہی نہیں بلکہ ہمارے بچوں کی موت کی بھی خبر ہے اور انکے بچوں کی بھی موت کی خبریں ہیں۔ جن کے نام پر تم جائیداد چھوڑ کر جا رہے ہو، انہوں نے بھی کل چھوڑ کر جانا ہے۔ اس پہ اللہ کا نام 'الوارث' تھوڑا سا سوچ لیں تو امید ہے کہ اس لفظ کا حق ادا ہو جائے گا۔ کیسے اللہ یہ سب کچھ کرتا ہے۔ یہ سارے اسبابِ معیشت ہیں۔ یہ ساری چیزیں مل رہی ہیں تو پھر اس دنیا کا کام ہو رہا ہے۔ یہ بات سورت مریم آیت 40 میں پڑھیں گے؛

اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا وَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾ ہم ہی زمین کے اور جو لوگ اس پر (بستے) ہیں ان کے وارث ہیں۔ اور ہماری ہی طرف ان کو لوٹنا ہو گا۔

یہ چیز انسان کی دنیا میں رہی سہی خواہش بھی ختم کرتی ہے۔جمال الدین افغانی مکہ کے اُستاد تھے۔کسی نے اُن کی بات سُنائی کہ اُنہیں اپنے پیشے سے بڑی محبت تھی۔ایک دن کلاس میں پڑھا رہے تھے، ایک دم پیٹ میں درد اُٹھا۔اُنہیں ہسپتال لے جایا گیا۔کچھ ٹیسٹ کر کے اُنہیں واپس بھیج دیا گیا۔اگلے دن پھر کلاس میں آ گئے۔رپورٹس کا رزلٹ ایک ہفتہ بعد ملنا تھا۔ہفتہ گزرنے کے بعد ایک شاگرد کو بھیجا کہ تم میری رپورٹس لے آؤ، میں پڑھا رہا ہوں۔جب شاگرد واپس آیا اور انہوں نے پوچھا کہ لے آئے رپورٹ تو شاگرد رونے لگا۔کہا کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔رزلٹس سُن کے سب رونے لگے۔تو انہوں نے کہا کہ روتے کیوں ہو، جب اللہ مجھ سے ملنے کا شوق رکھے ہیں تو کیا میں اُن سے ملنے کا شوق نہ رکھوں۔اور آخری دن تک اپنے کام پہ رہے۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے شخصیات بنائی ہیں۔آج ہم کوئی ایک ایسی شخصیت بنا پائیں تو وہ ہزاروں پہ بھاری ہے۔جن کو ہر حال میں کام کرنا ہے۔جن کی زندگی، موت، خوشی، غم اس کام کے ساتھ ہے۔اللہ کا دین پیچھے نہیں کرنا۔یہ وہ لوگ ہیں جن کو پتا ہے کہ اللہ ہمارا وارث ہے۔ہم اپنے کام ایسے کرتے ہیں کہ شائد اگر ہم نے نہ کیئے تو ہوں گے ہی نہیں۔تو پھر واقعی ہی نہیں ہوتے کیوں کہ اللہ کہتا ہے جاؤ پھر خود کرو۔ایک مشکل سے ہماری جان نہیں چھُٹی تو دوسری شروع ہو جاتی ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ پہلے جو لوگ تم میں سے ہو گزرے ہیں اُن کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں ۔

اب یہ میری اور آپ کی باتیں ہیں۔اللہ کہتا ہے تمہیں تو خود نہیں پتا کہ کون کہاں اٹک جائے گا لیکن ہمیں سب پتا ہے۔یہ آیات نبوت کے بالکل ابتدائی دور کی ہیں۔نبیؐ اور اُن کے ساتھیوں کو کہا جا رہا

ہے کہ آپکو نہیں پتا کون آپ کی پکار پہ لبیک کہے گا۔ کیا پتہ چلا کہ اگر دنیا میں نہیں بھی پتہ چلے گا تو قیامت کے دن پتہ چل جائے گا کہ کون آگے بڑھنے والا ہے اور کون پیچھے رہ جانے والا۔ اس آیت کے بہت سے مختلف رنگ ہیں اس آیت کی چھ سے زیادہ تفاسیر ہیں۔

1۔ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ وہ ہیں جو نیکیوں میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور الْمُسْتَأْخِرِيْنَ جو نیکیوں میں پیچھے رہنے والے ہیں۔ دعا کیجئے اللّٰهُمَّ لَا تجعَلنا مِنهُم

2۔ اسی طرح الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد وہ لوگ جو پہلے گزر گئے ہیں یعنی جو زندگی کے پہلے دور میں گزر چکے اور الْمُسْتَأْخِرِيْنَ جو بعد میں آنے والے ہیں۔

3۔ پھر اسی طرح الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد امت محمدیہ ﷺ میں پہلے آنے والے لوگ یعنی شروع کے دور کے لوگ جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب کا دور تھا، وہ لوگ اور الْمُسْتَأْخِرِيْنَ سے مراد آپؐ کی امت کے آخری دور کے لوگ جیسے آج ہم اور آپ ہیں۔

4۔ پھر الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد وہ لوگ جو نیکیوں میں آگے بڑھ گئے اور جنت میں سب سے پہلے پہنچ گئے، اور الْمُسْتَأْخِرِيْنَ جو جنت میں جانے سے پیچھے رہ گئے۔

5۔ پھر الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد وہ لوگ جو نماز میں سب سے پہلی صف میں جا کے کھڑے ہو جاتے تھے اور لوگ ان کو بھی مجنوں اور دیوانہ ہی کہتے تھے۔ الْمُسْتَأْخِرِيْنَ جو آخری صف میں آخر میں جا کر کھڑے ہو جاتے اور دو ٹھونگے مار کے کہتے ہم نماز پڑھ آئے ہیں۔

6۔اسی طرح الْمُسْتَقْدِمِيْنَ سے مراد اسلام کو جلدی قبول کرنے والے لوگ اور الْمُسْتَأْخِرِيْنَ جو دیر کرنے والے ہیں۔

میں اور آپ اپنے آپ کو چیک کریں کہ میں کس میں ہوں ۔الْمُسْتَقْدِمِيْنَ میں یا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ میں۔ جب مجھے اللہ کا کوئی کام کرنے کو ملے یا کوئی والنٹیئر کام کرنے کی آفر آئے تو کیا میں الْمُسْتَقْدِمِيْنَ میں سے ہوتی ہوں یا الْمُسْتَأْخِرِيْنَ میں سے۔ تیرہ پارے پڑھنے کے بعد آپ کا دل خود چوکیدار بن چکا ہو گا ۔ آپ کو صرف پیغام ملے گا اور آپ اس پر لبیک کہتے ہیں یا نہیں یہ آپ کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اگر قرآن کی کلاس میں چار یا پانچ گھنٹے بیٹھنے کے بعد بھی ہم میں فرق نہ آئے تو پھر یہاں آنے کا فائدہ کیا ہے۔ اگر ابھی بھی ہماری نمازوں میں، نیکیوں میں سستی ہے، دل اور عمل ابھی بھی گندے ہیں تو پھر آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آگے کیا ہو گا۔

یہ میں اور آپ خود اپنے آپ سے پوچھیں گے۔ اللہ تعالی ہمیں عمل کی توفیق دے۔ (آمین) ہم نے ابھی تک کے سبق میں یہ دیکھا کہ دنیا بیکار میں یہ ایک حادثاتی طور پر نہیں بنائی گئی۔ چند حقائق ہیں ان کو دیکھ لیجئے۔

اللہ تعالی نے اس دنیا میں ایک نظام رکھا ہے۔ ہم نے یہاں لفظ بروج پڑھا۔ یہ برج کی جمع ہے قصر یا مضبوط عمارت کو کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ یہاں اس لفظ کو آسمان کی بارہ منزلیں یا جس کو لوگ بارہ ستاروں کے نام سے جانتے ہیں اس سے جوڑ کے دیکھیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جس طرح زمین میں اللہ تعالی نے چیزوں کو مختلف طریقوں سے سجایا ہوا ہے، اسی طرح سے آسمانوں پر بھی کچھ اس قسم کی چیزیں ہیں۔ یہ گلوب جو ہمیں نظر آتا ہے یہ گھومتا ہے۔ جس طرح گاڑی کا پہیہ اپنے ایکسل پر گھومتا

ہے اسی طرح اللہ تعالی نے اس دنیا کو ایک ایکسل پر رکھا ہے۔ یہ زمین اس کے اوپر بالکل سیدھی نہیں گھوم رہی۔ اس کو اس طرح سمجھیں کہ اگر یہ دنیا اپنے ایکسل پر 25 کی ڈگری پر گھومتی تو یہ بالکل سیدھی ہوتی۔ لیکن یہ 25 کی بجائے 23.5 کے تھوڑے سے فرق پر ہے۔

رکوع کی حالت کو اپنے ذہن میں لائیں۔ جس طرح ایک انسان کی رکوع کی حالت ہوتی ہے بالکل اس دنیا کی یہ حالت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ہر چیز اپنے دائرے میں کام کر رہی ہے اگر یہ زمین بالکل سیدھی ہوتی تو جتنی پہاڑوں پر برف ہے وہ سب پگھل کر دنیا میں پھیل چکی ہوتی اور خشک ہو جاتی اور دنیا میں پانی کا نام بھی نہ ہوتا۔ اور اگر یہ 23.5 کی بجائے 23.2 ہو چکی ہوتی، یہ صرف معمولی ڈگری کا فرق ہے، تو اگر اتنے فرق بھی گھومتی تو پولز پر جتنی برف ہے وہ ساری برف یورپ کے اندر پگھلتی اور یورپ میں زندگی ممکن نہ ہوتی۔ جب زمین گھومتی ہے تو اس کی وجہ سے ہوائیں چلتی ہیں۔ پن چکی کا تصور ذہن میں لائیں۔ جب پن چکی گھومتی ہے تو بجلی پیدا ہوتی ہے تو اسی طرح سے جب زمین گھومتی ہے تو ہوائیں چلتی ہیں۔ اگر یہ زمین گھومنے کی بجائے ایک جگہ رکی ہوتی تو جتنے بادل سمندروں کے اوپر بنتے وہ واپس سمندروں کے اوپر برس جاتے، اور پوری دنیا میں سیلاب آجاتا۔ خشکی کے اوپر بادلوں کا برسنا ان ہواؤں کی وجہ سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ کا لَوَاقِحَ کہتے ہیں۔ کہیں یہ پولن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جا رہی ہیں اور کہیں بارش برسانے کا سبب بنتی ہیں۔ جتنی سائنس کی ترقی بڑھتی جا رہی ہے اتنا اللہ کی قدرت کے مظاہر بڑھتے جا رہے ہیں۔

کائنات میں جتنی بھی زندہ چیزیں ہیں ان میں سب سے چھوٹی چیز امیبا ہے جو صرف ایک سیل سے بنا ہے۔ اور ہمارا جسم اربوں کھربوں سیلز سے بنا ہے۔ اسی سے آپ اپنے اور امیبا کے فرق کو نوٹ کر لیجئے

۔ان سب کو آکسیجن کی ضرورت ہے اور کہتے ہیں فضامیں 20 فیصد آکسیجن رہنی چاہیے اگر اس سے زیادہ ہو تو ایک ماچس کی تیلی کے جلتے ہیں پوری دنیا میں آگ کے انگارے شروع ہو جائیں، اور اگر بیس فیصد سے کم ہو تو لوگوں کو سانس لینے میں دشواری ہو۔ اللہ تعالی نے اس سارے سلسلے کو درختوں کے ذریعے تناسب میں رکھا۔ درختوں کو سائنس کی زبان میں lungs of the earth کہتے ہیں۔ یہ زمین کے پھیپھڑے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ جتنی آکسیجن چاہئے اتنی رہ جاتی ہے اور باقی فالتو کسی اور طریقے سے باقی چیزوں میں استعمال ہو جاتی ہے۔ جہاں درخت زیادہ ہوتے ہیں وہاں سانس لینا اس لیے بھی آسان لگتا ہے کہ وہاں آکسیجن کی مقدار بہت ہی مناسب ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ذرائع ختم ہو رہے ہیں اور دنیا میں آبادی زیادہ ہو رہی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالی نے کہا کہ ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے سے اتارا ہے۔ تو شروع میں دنیا تھوڑی تھی تو اناج بھی تھوڑا چاہیے تھا۔ کوئلہ جو جلانے کے کام آتا ہے، جب اس کے ذرائع کم ہونے لگے تو سوئی گیس بر آمد ہو گئی۔ آج کے دور میں نیوکلیئر فیول آ گیا۔

ایک فیگر نوٹ کیجیے کہ جو انسان کو حیران کن حد تک لے جاتا ہے کہ 60 ہزار میگاواٹ بجلی بنانے کے لئے کل کے دور میں 18 ملین ٹن کوئلہ چاہئے تھا۔ یعنی اتنا زیادہ کوئلہ ہو گا تو 60 ہزار میگاواٹ بجلی بن سکیں گی۔ آج کے دور میں اس کا نعم البدل یورینیم ہے۔ صرف 7 کلو یورینیم سے اتنی ہی بجلی آج نئینیو کلئیر ری ایکٹر کے طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔ اللہ کو پتہ ہے کہ اس نے کب کون سا معاملہ کس طرح سے کرنا ہے۔ اللہ کہتا ہے تمہیں تو پتا ہی نہیں ہے، ہم سب جانتے ہیں۔ اگر آپ پانی کے بیکٹیریا کو دیکھ

لیں کہ اللہ تعالی نے اس کی زندگی کا نظام کیسے چلایا ہوا ہے تو حیران رہ جائیں۔ یہ پانی والے ماحول میں رہتا ہے اگر اس کو اس کے حسب موافق حالات ملیں تو آج پوری زمین بیکٹیریا سے بھر جاتی۔

آج اس وقت دنیا میں کہیں پانی ہے، کہیں خشکی ہے۔ اس کی وجہ سے بیکٹیریا کی تعداد دنیا میں اتنی ہی ہے جس سے انسان فائدہ اٹھا سکے۔ پھر اسی طرح دیمک ہے جس کا تذکرہ پیچھے ہوا تھا کہ دیمک کی ایک قسم 2 ملین انڈے دیتی ہے اور جن میں سے صرف 500 انڈوں میں سے دیمک نکلتی ہے اور باقی انڈے کوئی اور مخلوق کھا جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر وہ سارے کے سارے انڈے دنیا میں موجود رہیں اور ان سے دیمک نکلے تو پوری دنیا دیمک سے بھر جائے۔ مرغی اور مچھلی تو ہماری آنکھوں کے سامنے دیکھی ہوئی چیزیں ہیں مرغی کتنے انڈے دیتی ہے، اگر ہر انڈے میں سے چوزہ نکلے تو اس دنیا میں مرغیوں اور چوزوں کی فوج ہو۔ یہی حال مچھلیوں کا ہے۔ شہد کی مکھی اپنی زندگی میں 50 ہزار اڑانیں چلتی ہے، سورہ نحل میں پڑھیں گے 50000 اڑانوں کے بعد صرف ایک چائے کا چمچ شہد بناتی ہے۔ اتنی محنتوں کا نتیجہ اور انسان اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

پیچھے ہم نے شارک کا ذکر پڑھا تو شارک کے منہ میں دانتوں کی ایک لائن نہیں ہوتی جیسے ہمارے منہ میں ہے، بلکہ اس کے پورے منہ میں مختلف طریقوں سے دانتوں کی لائنیں ہوتی ہیں۔ جب یہ گوشت کھاتی ہے اس کے دانتوں کی لائنوں میں گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں پھنس جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا انتظام ایسے کیا ہے کہ "ریمورا" نام کی ایک مچھلی ہے، وہ بیٹھ کے اس کے دانتوں میں پھنسا ہوا گوشت کھاتی رہتی ہے۔ وہ رہتی ہی اس کے دانتوں میں ہے۔ ہیں اللہ کہتا ہے کہ تم رازق ہو! نہیں، سب کا رازق اللہ ہے۔

ہمارے جسم میں خون کتنے مراحل کے بعد بنتا ہے اور مچھر آپ کے جسم پہ بیٹھ کے اس کو لے کے چلا جاتا ہے۔ اللہ نے اس کا رزق لکھا ہے۔ آپ کے کھانے کا بہترین حصہ مکھی لے جاتی ہے اس کا رزق بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح وہ ہمارا رب ہے اسی طرح ہر مخلوق کا بھی وہی رب ہے۔ اللہ تعالی نے اس کائنات میں بڑا خوبصورت نظام رکھا ہوا ہے۔ ایک فصلوں کا کیڑا تھا جو فصلوں کو بہت نقصان دے رہا تھا تو اس کو ختم کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ ان فصلوں پر ایک ایسی دوائی ڈالی گئی جس سے وہ کیڑا ختم کر دیا گیا۔ جو نہی وہ کیڑا ختم کیا گیا تو جو چیز مشاہدے میں آئی وہ یہ تھی کہ "مناک" نام کی تتلی تھی وہ بھی ختم ہو گئی ہے۔ یہ تتلیوں کی بہت کار آمد قِسم ہے۔ پتا چلا کہ وہ کیڑا جو انسانوں نے دوائی ڈال کر ختم کیا، وہ اس تتلی کی خوراک تھی۔ جب وہ کیڑا ختم ہوا اور ان کی خوراک ختم ہوئی، تو ان کی قسم بھی ختم ہو گئی۔ جس مچھر سے ملیریا پیدا ہوتا ہے کینیڈا میں اس مچھر کو ختم کیا گیا تا کہ ملیریا کی بیماری پر قابو پایا جا سکے۔ جب اس کو ختم کیا تو ایک اور ایسی بیماری پیدا ہو گی جس کے لیے پھر نقلی طریقے سے اس مچھر کو پیدا کرنے کی ضرورت پڑی۔ تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ مچھر سے ملیریا تو پیدا ہوتا ہے لیکن وہ جو دوسری بیماری تھی اس کے جراثیم کو بھی کھاتا ہے۔ تم نے اللہ کی وہ قدر نہیں کی جو اسکی قدر کرنے کا حق تھا۔ انسان جتنا فطرت کے اندر دخل اندازی کر رہا ہے اتنا اس دنیا کا نظام بگڑ رہا ہے۔

انشاء اللہ زندگی رہے گی تو ہم دیکھیں گے کہ ہم ہیں کیا، اور ہماری اوقات کیا ہے، اور ہم کیا بنتے ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو اپنی نظر سے دیکھا ہے، لیکن اللہ ہمیں خود کو حقیقت کی نظر سے دیکھنے والا بنا دے۔

اب آدم اور ابلیس کی کہانی ایک نئے انداز میں پڑھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بڑے خوبصورت انداز سے انسان کے شعور کو بیدار کیا کہ تمہارے پاس اکڑنے کی، بڑا بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تم جتنے مرضی بڑے بن لو تم بڑے نہیں بن سکتے۔

آیت 26 سے 48 تک انسان، ابلیس اور آدم علیہ السلام کی کہانی ہے۔ اس سے پہلے یہ موضوع ہم دو دفعہ پڑھ چکے ہیں۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ الاعراف میں۔ ترتیب کے اعتبار سے اب یہ تیسرا موقع ہے جب ہم اس موضوع کو پڑھیں گے۔ آیت 26،

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ صَلۡصَالٍ مِّنۡ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲۶﴾ ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا۔

اب حضرتِ انسان کا تعارف۔ انسان اپنے تعارف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ خود کو کسی بڑے کارشتہ داریا بہن بھائی کہلوانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اللہ کہتا ہے آؤ میں تمہیں انسان سے ملواؤں۔ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ۔ یہ آیت ڈارویشن کے نظریے کا ردّ بھی ہے۔ اللہ یہ نہیں کہتا کہ پہلے ہم نے انسان کو بندر بنایا، پھر انسان بنایا۔ پہلے انسان بنایا اور کس سے بنایا۔ مِنۡ صَلۡصَالٍ۔

ان تین ٹرمز کو سمجھ گئے تو ہم سب اپنے آپ کو بہت اچھی طرح سمجھ جائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کس چیز سے پیدا کیا۔ اس میں سب سے پہلا لفظ صَلۡصَال ہے، دوسرا لفظ حَمَا اور پھر مَّسۡنُوۡن۔ صَلۡصَال کا لفظ روباعی ہے۔ روباعی وہ ہوتی ہے جس میں چار لفظ ہوتے ہیں۔ ص، ل، ص، ل اس کا روٹ ہے۔ صلصلہ، اس کے معنی ہیں باقی ماندہ پانی جو مشکیزے میں ہلنے کی گڑ گڑاہٹ کے مشابہ ہو۔ اسی طرح جب گھڑے میں پانی تھوڑا رہ جائے اور اس کو سر پر رکھ کر چلیں تو پانی کا کناروں کے ساتھ

بجنے سے جو آواز آتی ہے اس کو صلصلہ کہتے ہیں۔ اس میں کھنکھنانے اور بجنے کا معنی آرہا ہے۔ انسان کو کہا جارہا ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھو۔ تم گھڑے میں بچے ہوئے ایک پانی کی مانند ہو۔ اور خالی برتن زیادہ بجتا ہے۔

اگلا لفظ ہے حَمَا۔ عربی زبان میں سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بدبو پیدا ہو چکی ہو۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کیچڑ جس کا خمیر اٹھ چکا ہو۔ تو انسان کو ایسے کیچڑ اور گارے سے پیدا کیا جس کے اندر بدبو پیدا ہو چکی ہو۔

انسان کے تعارف میں تیسر الفظ ہے مَّسۡنُوۡن۔ یہ لفظ عربی زبان میں دو مختلف معنوں میں آتا ہے۔ اس کا روٹ س،ن۔ن، "سنا" ہو گا۔ اس کا ایک مطلب متغیر ہوتا ہے۔ منتن کہہ لیجیئے، املس بھی کہہ سکتے ہیں. مطلب یہ کہ ایسی سڑی ہوئی مٹی کہ جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو چکی ہو۔ اس کا دوسرا معنی مصور یا مصبوب، قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ دونوں کو الگ کرکے دیکھیں تو مَّسۡنُوۡن کا ایک معنی متغیر ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ چیز جس کا رنگ بدل چکا ہو۔ اگر آپ مٹی کو کچھ دن رکھ کر دیکھیں تو پہلے اس میں لیس آتی ہے پھر اس میں کیڑے آجاتے ہیں۔ تو یہ کیڑوں کا پڑنا، جان پڑنا ہے۔ آدم کا پتلا تب بنا جب اس میں کیڑے پڑ گئے۔ یہ کیڑا "جان" ہے۔ انسان بے جان مٹّی سے نہیں پیدا کیا گیا۔ جب اس مٹی میں حیات کا مادہ پیدا ہوا تب انسان کو بنایا گیا۔

آپ دیکھیں کہ انسان نہ سونے سے بنا ہے نہ چاندی سے اور نہ زعفران سے اور نہ کستوری سے۔ یہ حَمَاٍ مَّسۡنُوۡنٍ سے بنا ہے اور انسان کی اکڑ دیکھیں۔ اس کا خود کو بڑا سمجھنا اور اپنے رب کے آگے بولنا

دیکھیں، رب کے معاملے میں اتنا بے نیاز ہونا دیکھیں، انسان اگر خود پر غور کرے کہ وہ کس چیز سے بنا ہے تو کبھی اللہ کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ اگر اللہ چاہتا تو انسان کو سونے سے بنا سکتا تھا لیکن مٹی سے بنے ہوئے انسان کی اتنی اکڑ ہے، اگر سونے سے بنتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔

پھر تو انسان اپنے نفس کو خدا بنالیتا۔ ان تمام الفاظ کو جمع کریں تو تین مراحل بنتے ہیں۔ پہلے مٹی گھولی پھر اس میں لیس آگئی۔ عربی زبان میں مٹی کے مختلف معنی ہیں سوکھی مٹی کو 'تراب' کہتے ہیں۔ 'طین' نم دار مٹی، 'لازب' لیسدار مٹی، چکنی مٹی، حماجب مٹی سڑ جائے اور اس میں بدبو پیدا ہو جائے۔ کسی گاؤں کی گلیوں میں بارش کے بعد کا منظر ذہن میں لے آئیں، اس کے بعد اگلی سورت ہوتی ہے صلصال خُشک کھنکنا تا ہوا کیچڑ، اگلی کیفیت ہوتی ہے فخار، یہ وہ صورت ہوتی ہے کہ جب تمام مراحل سے گزر کر مٹی کے برتن کو آگ پر پکایا جائے، تو وہ فخار ہوتا ہے۔ کھنکھنا تا ہوا۔ پھر 'سعید' زمین کی سطح کا اوپر کا حصہ اور اوپر کا گرد و غبار۔

قرآن میں یہ تمام الفاظ انسان کی تخلیق کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ لفظ مسنون سنت سے ہے یعنی 'ڈھلا ہوا' کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو یہ شیپ دی۔ یہ کام ان کے عمل میں ڈھلا ہوا ہے۔ اور اگر مسنون کو پہلے معنی میں لیں تو اس کا مطلب ہے پرانا۔ تو سنت سے مُراد پرانی چیز۔ اس کا الٹ ہے مُحدث تو "كُلُّ مُحدَثَة بدعة" بدعت نئی چیز کو کہتے ہیں۔ آج لوگوں کو دین نہ سمجھ آنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ بدعات کو دین سمجھ لیتے ہیں۔ نئی چیزیں خوبصورت لگ رہی ہوتی ہیں اور سنت کو پرانا سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔

اللہ تعالی کہتے ہیں کہ ہم نے انسان کو اس طرح سے بنادیا کہ وہ ٹھیکری کی طرح بجنے لگا!

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم آگ کی لپٹ سے پیدا کر چکے تھے۔

پہلے حضرت آدم یعنی انسان کی بات کی اب جنات کی بات کر رہے ہیں۔ جان، الانسان کا الٹ ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام کو "ابو البشر" کہتے ہیں اسی طرح جان "ابو الجن" کو کہتے ہیں۔ یعنی جنوں کا بڑا۔ انسانوں کے بڑے حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور الجان کے بڑے، اس میں مفسرین کی ایک رائے ہیں کہ جان جنوں کا بڑا۔ جس سے آگے ان کی نسل شروع ہوئی۔

دوسری رائے یہ ہے کہ جان جن کی جمع ہے۔ تو پتہ چلا کہ انسان کے دنیا میں آنے سے پہلے جنات موجود تھے۔ جنات کو نار سموم، سموم والی آگ سے پیدا کیا گیا۔ سموم، سمعۃٌ ' ' سے ہے۔ سوئی کا ناکا۔ سَم، سوراخ کو کہتے ہیں۔ یا گھسنے کا موقع دینے والی جگہ کو کہتے ہیں۔ زہر کو بھی سَمّا کہتے ہیں۔ اسی طرح آگ کے شعلے کا وہ حصہ جو بظاہر نظر آتا ہے اور اس کے گرد ہالہ بن جاتا ہے۔ ہالہ کی صورت میں یہ شعلے کا وہ حصہ ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ شعلے کے اس نہ نظر آنے والے حصے کا ٹمپریچر عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے مراد وہ شدید ہوا ہے جس سے جنات کو پیدا کیا گیا۔ اگرچہ جنات کو آگ سے پیدا کیا گیا لیکن وہ آگ نہیں ہیں، بالکل ایسے جیسے انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا لیکن انسان مٹی نہیں ہے۔ اللہ تعالٰی نے اپنی مخلوقات کو مختلف چیزوں سے پیدا کیا۔ انسان کو مٹی اور مٹی کی مختلف چیزوں سے اور جنوں کو آگ سے پیدا کیا۔ انسانوں کے مزاج میں ٹھہراؤ، نرمی ہونی چاہیے اور شیطان اور جنون کے اندر جوبن اور جولان ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

پھر یاد کرو اُس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔

یہاں یہ نہیں کہا کہ آدمؑ کو بنا رہا ہوں بلکہ کہا کہ ایک بشر بنا رہا ہوں۔ ورنہ ہماری سوچ صرف آدمؑ تک رہتی۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا" ۔

سَوَّيْتُهٗ یعنی آدمؑ کو بنانے کے بعد اُس کی نوک پلک درست کرنا۔ سورۃ الانفطار میں آتا ہے الَّذِىْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ﴿۷﴾ جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا۔ یعنی آنکھیں، کان، ہاتھ سب برابر ہیں۔ بڑا چھوٹا نہیں۔ ہماری جلد جو ہموار ہے اسے سَوَّيْتُهٗ کہتے ہیں۔ جیسے کسی عمارت کو تعمیر کرنے کے بعد اُسے سجایا جاتا ہے، رنگ رغن کیا جاتا ہے۔ اگلا مرحلہ وَنَفَخْتُ فِيْهِ اور پھونک دوں میں اس میں اپنی روح کو۔ پہلے جسم کا بُت بنا، گیلا تھا، اُسے سکھایا۔ پھر سارے مرحلے پورے ہونے کے بعد کہا کہ اب اس کے اندر کے مراحل پورے کرنے کے لیے اس میں اپنی روح پھونک دوں۔ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ، تو گِر پڑنا اس کے لیئے سجدے میں، فَقَعُوْ کا لفظ وَاقَعَ سے ہے جس کے معنی گرنے کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کے مختلف مراحل بتائے۔ پہلے انسان اور جن کی تخلیق کا فرق بتا دیا گیا۔ صحیح مسلم کی روایت میں آتا ہے کہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ جنوں کو آگ سے پیدا کیا گیا اور

آدم کو اس چیز سے پیدا کیا گیا جو تمہیں بتا دیا، حَمَاٍ مَّسْنُوْن کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تینوں مخلوقات موجود ہیں۔ اگر تینوں چیزوں کو اکٹھا کر کے دیکھ لیں تو جسمانی طور پر جو سب سے کمتر میٹیریل ہے وہ انسان کا ہی لگتا ہے۔ کیونکہ آگ بھی کچھ چمکتی ہے، نور بہت ہی چمکتا ہے۔ مٹی، انسان کا وجود اندھیرا تھا۔ بالکل مٹی کے کچے گھر کی طرح، اندر اندھیرا تھا، تو اللہ نے اس کے اندر وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اللہ نے اس کے اندر اپنی روح پھونکی۔ یہ اصل میں وہ کیفیت ہے جسکو آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان میں اعلیٰ اخلاقیات ڈال دیں۔ سائنس صرف پہلے حصے کو مانتی ہے، یعنی جس کے حصے کو۔ روح کے حصے کو نہیں مانتی۔ اسی لیے آج سارا زور جسم کو صحت مند رکھنے پہ دیا جاتا ہے۔ یہ کھائیں، یہ وٹامن کھائیں، اس پہ ریسرچ ہو رہی ہے۔ روح پہ ریسرچ کرنے والے بہت تھوڑے ہوں گے۔ تو یہ رُّوْحِيْ کیا ہے، اللہ نے عزت دی ہے۔

اگر اسکی ذرا سی تفسیر غلط کریں تو اس کے اندر اتنا بڑا شرک ہے جس میں آج بہت زیادہ لوگ ملوث ہیں۔ لوگوں نے اس لفظ سے حلول کو جائز کر دیا۔ اندر تو، باہر تو، اوپر تو، نیچے تو، نعوذُ باللہ، اللہ تعالی نے انسان میں اپنی روح نہیں ڈالی تھی (نعوذُ باللہ)۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اللہ بندے کے اندر آ گیا۔ اس سے مراد نسبت ہے جیسے کعبۃ اللہ، بیت اللہ، عباد الرحمن۔ اسی طرح اللہ تعالی نے بندے کو عزت دی کہ میں نے اس میں اپنی روح ڈالی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں نیکی کا جذبہ ڈال دیا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ نے اَلَستُ بِرَبِّھم، کا وعدہ لیا تھا۔ اس کو اپنی پہچان دے کر دنیا میں بھیجا۔

بہت واضح ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا لیکن پھر بھی کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نور ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ اور یہ غلط فہمی ہے۔ اللہ کے نبی نور نہیں تھے بلکہ نورانی کام کئیے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مٹی کا تھا جیسے ہمارا ہے، لیکن ان زندگی میں وحی کا نور تھا جس نے ان کے کردار کو اعلیٰ بنا دیا۔

اب یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی ان تینوں مخلوقات میں سے کس کے گھر پیدا ہوئے۔ اگر آپ لوگ کہتے ہیں نور تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان فرشتوں کا خاندان تھا اور اگر آپ ناری خاندان سے جوڑتے ہیں تو اللہ کے نبی نعوذ باللہ جن نہیں تھے۔ اگر ہمیں یہ چوائس دی جاتی کہ کس خاندان میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ عقل کے حساب سے تو ہم مٹی کبھی نہ کہتے لیکن مٹی اور آگ کا تقابل کر کے دیکھ لیں تو مٹی بہتر ہے کیونکہ ابلیس نے بھی اس بات پر بحث کی تھی ہم سورۃ اعراف میں پڑھ چکے ہیں کہ مجھے آگ سے پیدا کیا اور آگ مٹی سے زیادہ بہتر ہے۔

مٹی کے وجود میں زندگی ہے ایک بیج آپ مٹی کو امانتاً دیتے ہیں اور وہ ہزاروں بیجوں کی صورت میں آپکو واپس کرتی ہے۔ اسی ایک بیج کو آپ آگ میں ڈال لیں تو وہ ختم ہو جائے گا مٹی کا وجود 'ری پروڈیوس' کرتا ہے۔ مٹی کے مزاج میں ٹھہراؤ ہے۔ مٹی جم جاتی ہے تو اس کے اندر بڑے بڑے درخت اور بڑی بڑی عمارتیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کسی عمارت کی بنیاد کو آگ لگائیں تو ساری عمارت گر جائے گی۔ مٹی کے وجود کے اندر عاجزی ہے، مضبوطی ہے جبکہ آگ میں ایک جولان اور جلنا ہے۔ جتنے بھی تقابل کر لیں، آگ مٹی سے کبھی بھی بہتر نہیں ہو سکتی۔ تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بظاہر کچھ

چیزیں دیکھنے میں ایسی لگتی ہیں کہ جیسے انہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن جس نے پیدا کیا اس کو پتہ ہے کہ یہ بہتر ہے۔

مٹی بھی اللہ نے پیدا کی۔ مٹی کو حقیر مت سمجھئے۔ یہ بالکل ایسے ہے جیسے سونا اور لوہا۔ سونا خوبصورت بھی ہے اور قیمتی بھی لیکن آپ کبھی سونے کی کان سے گندم کا پودا اگتا نہیں دیکھیں گے۔ اسی طرح اگر ہتھیار بنانے ہوں تو سونے کے نہیں بن سکتے۔ سونا تب خوبصورت ہوتا ہے جب وہ زیور میں ڈھلتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ کام کیا چیز آتی ہے۔ تو یہاں انسان کو سکھا دیا گیا کہ تمہیں ہم نے بہت بڑے مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ تم اپنے جسم کو اچھے کام میں لگاؤ۔ بنیادی طور پر انسان کا جسم بہت کمزور ہے۔ بہت ساری دوسری چیزوں سے ہمارا جسم ہلکا ہے۔ مثلاً ہاتھی کے وزن سے ہمارا جسم بہت ہلکا ہے، عقاب بہت دور تک دیکھتا ہے لیکن ہماری نظر کمزور ہے۔ کتے کے اندر سونگھنے کی حس تیز ہے، ہمارے اندر نہیں ہے۔ گھوڑا جتنا تیز دوڑ سکتا ہے ہم اتنا تیز نہیں دوڑ سکتے۔ اگر ہم جانوروں کی ایک ایک صفت کا تقابل کریں تو انسان جسمانی طور پر بہت کمزور ہے۔

انسان کو جس چیز نے عزت دلائی وہ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ ہے۔ جو لوگ جسم کے تقاضے پورے کرتے ہیں وہ جانوروں سے بھی بُرے ہیں۔ تو پتہ چلا کہ کسی انسان کا سب سے مضبوط پوائنٹ اس کی روح کی طاقت ہے۔ اس کی روح کی صحت ہے۔ میرے سامنے بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ جو بظاہر دیکھنے میں بہت کمزور ہیں۔ اگر وزن کیا جائے تو شاید بچے کے وزن کے برابر ہوں۔ لیکن اُنکے ارادے اتنے مضبوط، عزائم اتنے بلند کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیں۔

"دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا"۔

میرا اور آپ کا اصل وزن اس روح کا وزن ہے۔ اگر ایمان مضبوط ہو تو بیمار جسم بھی انسان کو کام کرنے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ لیکن اگر جسم مضبوط ہو کھائے پیٔے، بھاری جسم مٹی کی لاشیں بن جاتے ہیں۔ آج ہم نے صرف اس وجود کی فکر کی۔ جسم کی بیماری کو، روح کی بیماری کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ جسم بیمار ہو، انسان روح کی خوراک نہ چھوڑے، تو جسم میں بھی طاقت آجاتی ہے۔ اور اگر جسم بیمار ہو اور آپ اسے کسی بھی بیماری کا نام دیں، اپنے جرم کے سوا ہر وجہ سمجھ لیں اور اگر اسے روح کی مضبوطی دیں تو پھر دیکھیں تو وہ کیسے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ابو بکر صدیق اتنے دُبلے پتلے تھے کہ جب اپنا تہمد باندھتے تو وہ نیچے ڈھلکنے سے ٹخنوں سے نیچے چلا جاتا اور جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ روایت سُنی کہ وہ چند لوگ جن کی طرف اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور نہ ان سے محبت کرے گا اس میں ایک وہ شخص ہے جو ٹخنوں سے نیچے اپنا تہمد کرتا ہے۔ تو ابو بکر صدیقؓ رونے لگے کہ اللہ کے نبی میں کیا کروں، میں اوپر باندھتا ہوں لیکن یہ پھر نیچے ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کے نبیؐ نے فرمایا! ابو بکر آپ ان میں سے نہیں ہیں۔ عبد اللہ بن مسعودؓ جس کو آج کی زبان میں کہہ سکتے کہ ہوا چلے تو ان کے اُڑنے کا خطرہ ہو۔ ایک دفعہ کھجور کے درخت پر چڑھ کے درخت کھجوریں اُتار رہے تھے، تو منافقوں نے ان کی پتلی ٹانگوں کا مذاق اڑایا۔ تو اللہ کے نبیؐ کو پتہ چلا تو آپؐ نے فرمایا کہ ابن مسعود کی ان ٹانگوں کا مذاق اڑانے والوں کو یہ نہیں پتا کہ کل ابن مسعودؓ کی ایک ایک ٹانگ اُحد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہو گی۔

آج انسانیت کس کی خدمت کرتی ہے۔ میں اور آپ سارا دن کی مصیبتوں میں پڑے رہتے ہیں۔ ہمارے غم صرف اس دنیا کے ہیں۔ اگر ہم غیب کے پردوں کو جھانک کر اللہ کی نظروں کو اپنے اوپر

لے کے دیکھیں تو ہم آئینہ دیکھنا چھوڑ دیں۔ چار لوگوں کی نظروں میں جچنے کے لئے ہم ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں، اور وہ ذات جس کے سامنے سجنے کی ضرورت ہے ادھر ہمارا حال کیا ہے۔ ایمان والا ساری زندگی جسم کو نہیں پوجتا۔ یہ جو آج چاروں طرف آپکو جسم کی راحت کے سامان نظر آتے ہیں یہ مسلمان ریاستوں میں نہیں ہوتے تھے اور جب اسلام آئے گا تو انشاءاللہ نہیں ہوں گے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے چلے جائیں تو ہمارے بڑے کہتے تھے اچھی خوراک کھائیں۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا گھر میں علاج کرو۔ ہم ڈاکٹروں کے چکر لگا لگا کے پاگل ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھیں علاج کہیں اور ہے، ہم ڈھونڈتے کہیں اور ہیں۔ یہ ان کو نہیں سمجھ آتی جن کا تعلق قرآن سے نہیں جڑا لیکن جنکا قرآن سے تعلق ہے، ان کو اس بات کی بہت اچھی سمجھ آجانی چاہیے۔

اس کتاب کے اندر قلبی اور روحانی طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہاں یہ سمجھا دیا کہ اگر صرف جسم ہے تو جانوروں سے بدتر ہے لیکن روح ڈال کے ہم نے تمہیں بہت کچھ بنا دیا۔ یہ اللہ کی ذات ہے جس نے مٹی کو اتنا حُسن دے دیا اور انسان کو عزت دی۔ کبھی راہ چلتے کسی خوبصورت انسان کو دیکھیں تو خیال آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو اتنا حسن دے دیا۔ تو جو جنت کہ اصل خوبصورت عورتیں ہوں گی وہ کیسی ہوں گی۔ مٹی کا برتن شیشے کی طرح چمکے تو کیسا لگے گا۔ جب انسان جنت میں جا کے اپنے اچھے اخلاق کے میٹیریل سے بنے گا، تو وہ کیا ہو گا۔

وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي کہہ کے اب آگے کہہ دیا فَقَعُوا لَهُ سٰجِدِيْنَ۔ یہ آدم کے مٹی کے وجود کے آگے فرشتوں کو نہیں جھکایا تھا بلکہ کہا کہ اگر انسان اچھے وصف پیدا کر لے تو فرشتے اُسے سجدہ کرتے ہیں۔

اسی لیئے کہا کہ اگر انسان اچھے کام کرے تو فرشتوں سے اچھا اور اگر بُرے کام کرے تو شیطان سے بھی بُرا۔ یہ بھی اس میں گہری بات ہے کہ انسان اچھے کام کر کے فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو جاتا ہے۔